تھی تو وہ سرکتا دکھائی دیتا تھا..

یہ کڑی مسافت دیر تک جاری رہی.. اگرچہ زور اُن دونوں کا لگ رہا تھا جو کشتی کو کھینچ رہے تھے لیکن اُن کی کشاکش کا تناؤ خاور کے بدن پر بھی اثر کرتا تھا.. وہ بھی کھچاؤ کی زد میں تھا.. کچھ دیر بعد کنارے کی ویرانی ختم ہو گئی اور یکدم بلند سطح سے ہرے بھرے کھیت اور شجر جھانکنے لگے.. وہ دونوں ان کھیتوں کو روندتے ہوئے چل رہے تھے.. کنویں اور ٹیوب ویل تھے.. اور کہیں کہیں گھر تھے جن کے صحنوں میں سے سرور اور ماماں گزرتے تھے اور بچے بلند کناروں سے جھانک جھانک کر نیچے پایاب پانیوں میں کبھی اٹکتی اور کبھی گھسٹتی اور پھر رواں ہوتی کشتی کو تکتے تھے..

اُس کے سر پر سے گزرتی یہ بستی سندھ کے کناروں پر آباد ایک معمول کا گاؤں نہ تھا.. یہ آبادی دریا کے بہاؤ سے کٹ رہی تھی.. دریا برد ہو رہی تھی.. جو کچھ تھا مسمار اور بے اختیار ہو کر سندھ کے اندر گرنے کو تھا.. کچھ حصہ گر چکا تھا اور بقیہ میں دراڑیں آ چکی تھیں.. کنارے فصیلوں کی مانند اونچے تھے لیکن اُن میں شگاف پڑ چکے تھے... وہ خاموشی سے بھرتے... ابھی اپنی جگہ پر قائم نظر آتے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے یکدم ایک بڑا حصہ اپنے ہی قدموں پر ڈھے کر دھڑام سے پانیوں میں گر جاتا.. اگر ریت اور مٹی کا یہ منہدم شدہ حصہ رقبہ میں بڑا ہوتا تو سندھ کے پانیوں میں فوری طور پر گم نہ ہوتا اور ایک مختصر سے جزیرے کی صورت میں کچھ دیر کے لئے اُبھرا رہتا اور پھر دریا کا زور اُسے برابر کر کے اپنے اندر سمو لیتا.. کئی گھروں کے صحن غائب تھے' شاید ایک ماہ پیشتر یا آج ہی وہ پانیوں میں گرے تھے اور اُن کے پیچھے جو کچے گھر تھے اب آگے آ چکے تھے اور کناروں پر معلق تھے' جھانکتے تھے' اپنی باری کے منتظر تھے کہ پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے.. وہ جانتے تھے بلکہ اُن کے مکین آگاہ تھے کہ اگلے چند روز میں یا چند ہفتوں میں یہ بھی سندھ کے اجل پانیوں میں گر جائیں گے اور اس کے باوجود وہ انہیں چھوڑتے نہ تھے.. اس بستی کے ٹائی ٹینک کے پیندے میں سوراخ ہو چکا تھا اور پانیوں کا سیلاب اُس کے وجود کو ڈبونے کے لئے اندر آ رہا تھا لیکن مسافر اسے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے.. اپنی صدیوں کی بود و باش' کھیت' قبرستان اور شجر چھوڑے نہیں جاتے بے شک ان کا ثمر ایک اپنا ملک ہو.. یا کناروں سے دور ایک نیا گھر ہو.. انسان آخری لمحے تک اپنے آپ کو یقین دلاتا ہے کہ موت دوسروں کو ہی آتی ہے مجھے شاید نہ آئے.. بستی دریا برد ہوتی جا رہی ہے شاید صرف میرا گھر بچ جائے..

کہیں سرسوں کے کھیت آہستہ آہستہ بھرتے تھے پانی میں گرتے تھے.. اُن کی زرد

ہریاول کے کئی بوٹے اُس کے دیکھتے دیکھتے ایک ایک کر کے مٹی کی گرفت میں سے اپنی جڑیں جھاڑتے بے جان سے ہو کر بلند کناروں سے نیچے گرتے جیسے فصیل کا دفاع کرنے والے سپاہی سینے میں تیر کھا کر نیچے آتے ہیں.. سندھ کے پانیوں پر آگرتے' کچھ دیر غرقاب رہ کر اُبھرتے اور پھر سطح آب پر تیرتے زردی کے ایک مختصر جزیرے کی طرح تیرتے مرکزی بہاؤ کی جانب بہہ جاتے۔

ایک ٹیوب ویل کا وہ پائپ جو اُسے نصب کرتے وقت کئی سوفٹ زمین کے اندر تک لے جایا گیا تھا اب مٹی کے سندھ میں گر جانے سے ننگا ہو رہا تھا اور اُس کی پوری لمبائی نظر آ رہی تھی..

شیشم کا ایک تناور درخت کنارے پر دم روکے کھڑا تھا اور ہلکی ہوا کے باوجود اُس کے پتے سہمے ہوئے تھے تالیاں نہیں بجاتے تھے' دریا کی جانب مٹی بُھر جانے سے اُس کی پر پیچ اور روپوش جڑیں اب برہنہ ہو رہی تھیں اور وہ وقت دور نہ تھا جب اُنہوں نے اُسے سہارنے سے لاچار ہو جانا تھا اور اُسے بھی منہ کے بل سندھ میں آگرنا تھا..

کیکر کے پستہ قد درخت جنہیں لگروٹ کہتے تھے اور دھریک کے درخت.. جھانکتے تھے اپنی باری کا انتظار کرتے تھے.. اُن کے پتے بھی مرجھا رہے تھے اور ٹہنیاں مردہ لگتی تھیں.. ان کی جڑوں کو بھی ہوا لگ چکی تھی..

یہ سب کچھ قربت مرگ میں تھا.. فنا کا منتظر تھا۔

کنارے کی گرتی فصیل میں ننگی ہو چکی جڑوں کا جال پھیلتا تھا..

اپنے کاندھوں پر رسّے کا مردہ اژدھا اُٹھائے جعفر اور سرور کنارے کے اوپر اپنے راستے میں آنے والے کھیتوں' گھروں اور صحنوں میں سے زور لگاتے گزرتے تھے اور رسّے کا تناؤ کشتی میں اُتر کر خاور کے بدن کو کھنچے جانے کی رمز سے آشنا کرتا تھا.. اور کشتی کو اس معدوم ہو جانے والی بستی کی مرگ کیفیت میں سے باہر لے جانے کی سعی کرتا تھا..

جتنا عرصہ وہ اس دریا بُرد ہوتے کناروں کے دامن میں رینگتے رہے اتنا عرصہ خاموشی رہی.. صرف پانی میں کشتی کی حرکت کی ہلکی ہلکی چھلک سنائی دیتی تھی.. نہیں تو چپ تھی..

بالآخر کنارے کی بلندی نیچے ہوئی اور روشنی بڑھ گئی.. وہ مسمار ہوتے کھیتوں' ننگی جڑوں والے اشجار اور دریا بُرد ہو چکے صحنوں کے کناروں پر جھانکتے کچے کوٹھوں کی زد سے باہر آئے اور کھلے پانیوں میں آگئے..

کشتی آپو آپ اپنی روانی میں آگئی اور سرور اور ماماں جعفر رسہ لپیٹتے ہوئے کشتی میں آئے اور ہانپتے تھکاوٹ سے چور ہونے کے باوجود فوراً بانس اُٹھالئے جیسے اُن کو ڈر ہو کہ کشتی پھر سے اُس دریا برد ہوتی بستی کی گرفت میں چلی جائے گی..

دائیں جانب کشتی کے فٹ پاتھ پر سرور کے پاؤں انتہائی پھرتی سے بھاگنے لگے اور بائیں طرف ماماں جعفر کے قدم اُٹھتے تھے اور بانس سندھ کے سینے میں اُترتے جاتے تھے..

یہ عجیب سندھ سائیں تھا جو بستیوں کو اُجاڑتا تھا..

کیسا مرشد تھا جو اپنے مریدوں کو برباد کرتا تھا..

فنا میں گرنے کے منتظر کھیتوں اور اشجار کی ننگی جڑوں کے منظر نے جیسے اُس کے اندر بھی اپنی جڑیں پھیلا دیں... عمر کے ساٹھویں برس میں اُس کے وجود کے شجر کی جڑیں بھی ننگی ہو رہی تھیں' بدن کی مٹی ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ رہی تھی.... اجل کے دریا کے کناروں پر وہ کتنی دیر اپنے آپ کو سہار سکتا تھا..

اگرچہ وہ کھلے پانیوں میں آچکے تھے لیکن وہ منتظر شجر اور گھر اُن کے ساتھ چلے آتے تھے.. سرسوں کے چند بوٹے ابھی تک کشتی کی نوک کے آگے بہاؤ کے زور میں گرفتار بے بسی سے بہتے اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔

جب کشتی گہرے پانیوں کے پورے زور میں آکر آزادی سے بہنے لگی... ریتلی تہہ سے بہت اوپر بلند پانیوں پر رواں ہو گئی اور اُسے کسی سہارے اور دھکیلنے کی ضرورت نہ رہی تو ان دونوں نے پسینے پونچھے چند لمبے لمبے سانس بھرے اپنے بانس رکھے اور مٹی کے کُجے کے منہ سے ململ کا کپڑا کھول کر اُس میں سے باری باری بوٹی کے مدھ بھرے چند گھونٹ حلق میں اُتارے اور پھر ایک مدت بعد اُس کی جانب دھیان کیا اور اچانک اُسے سامنے پاکر مسکرانے لگے..

"سائیں گھونٹ لگاؤ گے؟"

"نہیں.. تم پیو"

"سائیں یہ وہی ساوی ہے جو آخری ستارے کے ڈوبنے سے پہلے پہلے ہم نے گھوٹی تھی.. گھونٹ لگالو.. خالی نہ رہو"

"نہیں..."

اُسے تجربہ ہو چکا تھا کہ اس ساوی کے چند گھونٹ لگانے کے بعد انڈس کوئین کا

مردہ زنگ آلود ڈھانچہ بھی زندہ ہو جاتا ہے اور سندھ پر تیرنے لگتا ہے..

وہ ابھی تک دریا برد ہونے والے شجروں کی ننگی جڑوں میں جکڑا ہوا تھا اور اُس مٹ جانے والی بستی کی مرگ کیفیت میں سانس لیتا تھا "سرور یہ تمہارا دریا جسے تم سائیں بولتے ہو' اُن داتا مانتے ہو یہ کیسا دریا ہے کہ بستیوں کو کھا جاتا ہے.."

"سائیں جو زندہ رکھتا ہے وہی تو مارتا ہے... ویسے ادھر ہم مُہانوں میں ایک پرانا اکھان کھڑا ہے کہ راوی سونا' چناب چاندی اور سندھ سواہ... آپ والے پانی آپ کو سونا اور چاندی دیتے ہیں اناج اور ہریاولی دیتے ہیں پر سندھ... راکھ دیتا ہے.."

"سرور ہوئے..." آج کی آبی مسافت کے دوران وہ پہلی بار بولی... پکھی بولی... یوں بولی جیسے رُکھوں میں مور بولتا ہو..

"کیا ہے پکھئے..." سرور سامی کے اثر میں جھوم کر بولا..

"ایک اور اکھان بھی ہے ہم مُہانوں کا.." اُس نے خاور پر آنکھیں رکھیں" کہ راوی راسکاں... چناب عاشقاں... اور سندھ صادقاں..."

"راسکاں؟" وہ سمجھ نہ سکا اور سرور کی جانب دیکھا..

"ملیچھوں کو کہتے ہیں سائیں.." سرور نے ذرا شرمندگی سے کہا" ہمارا مامن ماسا بتایا کرتا ہے کہ اُدھر راوی کے کنارے ملیچھ لوگ رہتے تھے"

پاروشنی اپنے دریا کے کنارے بسنے والوں کو ہی صادق جانتی تھی..

راوی کے کناروں پر رہنے والوں کو ملیچھ گردانتی تھی.. یہ وہ تھے جو اسوا پر سوار ہو کر ادھر آئے تھے اور اُس کی بستیوں کو.. اُس کے ہڑپہ کو ویران کر دیا تھا..

اور پکھی نے راسکاں کہتے ہوئے آنکھیں جھپکی نہیں تھیں.. اُسے دیکھتی رہی تھی.. اور اُن میں ایک حدت تھی جو کسی بھی گلیشیر کے منجمد وجود کو پگھلانے پر قادر تھی..

خاور اُٹھا اور سر جھکا کر کشتی کے اندر جا کر لیٹ گیا..

راوی راسکاں!

اُس کے پنجے ربڑ کے لگتے تھے..

وہ ساری کی ساری ڈیکائے لگتی تھی..

ربڑ کی بنی ہوئی ایک پرفیکٹ جل مرغی..

لیکن اُس کی آنکھوں میں دھڑکنوں کے کھو جانے کی سراسیمگی تھی جو یہ عیاں کرتی تھی کہ وہ ایک کھلونا نہیں.. اپنے ہم جنس پرندوں کو فریب دینے کا ایک مصنوعی جال نہیں.. ربڑ کی بنی ہوئی نہیں.. ایک ابھی تک زندہ شے ہے جو بندھی ہوئی ہے اُس ڈور سے جس کا آخری سرا ایک نیم سیاہ توند پر تہبند اٹکائے موٹے بے ڈھب بدھا کے ہاتھوں میں ہے اور وہ قہقہے لگاتا ہے اور اُس ڈور کو کھینچتا اور کبھی ڈھیل دیتا ہے جو اُس جل مرغی کے پنجے کے ساتھ بندھی ہوئی ہے جو اپنے تئیں اس موٹے بدھا سے دور ہو جانے کے لئے سندھ میں تیرتی ہے اور دُور نہیں ہو سکتی وہیں رہتی ہے کیونکہ ڈور سے بندھی ہوئی ہے..

سندھ کے کناروں سے ذرا دُور.. کشتی سے پرے.. جہاں شام اُترنے کی کوشش میں تھی اور پانی مکمل سیاہی میں اُترنے سے ابھی گریز کرتے تھے اور آخری کرنوں کی مدھم زرد روشنی میں وہ پانی ایک دُھلی ہوئی پیلاہٹ میں رنگی چادر کی طرح بچھے تھے.. اُن پر.. پیلی سرسراتی چادر پر ایک جل مرغی تیرتی تھی.. ڈبکی لگاتی تھی.. کچھ لمحے زیرِ آب رہتی تھی' روپوش رہتی تھی اور پھر پانیوں میں سے اُبھرتی تھی... اپنے تئیں تیرتی تھی' کنارے سے دور ہو جانے کے لئے چھینٹے اُڑاتی تگ و دو کرتی تھی.. لیکن ایک ہی مقام پر جدوجہد کرتی چلی جاتی تھی.. پھر ڈبکی لگاتی تھی اور جب کچھ دیر بعد پانی پر ظاہر ہوتی تھی تو پھر وہیں کی وہیں ہوتی تھی..

بہت دیر اپنی عمر رسیدگی کی غنودگی میں گم... دریا بردگی کے عالم میں اشجار کی ننگی جڑیں ابھی تک ایک ہزار پائے کی صورت اُس کے نیم خوابیدہ بدن سے لپٹی ہوئیں.. پانیوں کے تحرک کے ہچکولے اُسے ایک آہستہ خرام جھولنے کی طرح ہلارے دیتے رہے اور وہ غنودگی میں گمشدہ غافل پڑا رہا اور پھر یہ جھولنا تھم گیا.. بہت دیر تک تھما رہا تو وہ کسل مندی میں آنکھیں ملتا اُٹھا اور کشتی کی چھت کے نیچے جھک کر پائدان پر قدم رکھ کر باہر آ گیا..

باہر شام اُترنے کو تھی' کشتی تھمی ہوئی تھی اور پانی مکمل سیاہی میں اُترنے سے گریز کرتے تھے.. اور اُن گریز کرتے پانیوں پر ایک پرندہ ایک ہی مقام پر تیرتا جاتا تھا.. کبھی ڈبکی لگاتا تھا اوجھل ہو جانے کی آخری کوشش میں.. اور پھر وہیں پر نمودار ہو جاتا تھا جہاں اُس نے ڈبکی لگائی تھی.. کیونکہ اُس کی ایک ٹانگ اُس ڈوری سے بندھی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا کنارے پر کھڑے نیم سیاہ توند پر تہبند اٹکائے... پرندے کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے

موٹے بدھا کے ہاتھوں میں تھا..

سرور اور ماماں جعفر بڑے اطمینان سے اور کسی حد تک اس کھیل تماشے سے محظوظ ہوتے کشتی کے برابر میں کھڑے دیکھتے تھے..

فہیم نے اُسے کسل مندی سے آنکھیں ملتے باہر آتے دیکھا تو اُس کے قریب ہو گیا "سائیں یہ اپنا عطااللہ ہے' میرے ساتھ سکول میں میچر ہے.. شکار کا بہت شوقین ہے سائیں.. ابھی اس نے اس جل مرغی پر فائر کر کے اسے گرایا ہے.. پر یہ مری نہیں.. ایک چھرا اس کے پروں کے اندر جا لگا ہے اور زخمی کر کے گرایا ہے.. نمانی اُڑ نہیں سکتی.. تو عطااللہ اس کے پنجے میں ڈوری باندھ کر اُسے پانیوں میں چھوڑتا ہے تو جل مرغی سمجھتی ہے کہ میں بہت تیرتی ہوں تو آزاد پنچھی ہو جاتی ہوں.. پانی میں ڈبکی لگاتی ہوں تو غائب ہو جاتی ہوں... پر نمانی جا نہیں سکتی' ڈوری سے بندھی ہے اور اُس کا سرا عطااللہ کے ہاتھ میں ہے تو کہاں جائے گی.."

وہ عطااللہ سے کسی حد تک شناسا تھا..

جب کشتی روانی میں ہوتی.. دھوپ سے کناروں کے ٹیلے اور ریتلے ٹاپو روشن ہوتے.. یا کبھی شام کی سرخی کوہِ سلیمان سے اُترنے والی ہوتی تو وہ ٹیلوں اور ٹاپوؤں میں سے کبھی ظاہر ہوتا اور کبھی بہت دیر تک اوجھل رہتا.. وہ صرف ایک تہبند میں ملبوس ہوتا جو بار بار اُس کی توند سے کھسکتا.. اور ہاتھوں میں ایک بندوق ہوتی اور نظریں آسمان کو کھنگالتی... وہ گرتا پڑتا کہیں نہ کہیں نظر آ جاتا..

عطااللہ نے اُسے کشتی سے باہر آتے ہوئے دیکھا تو نہایت مؤدب ہو کر ایک ہاتھ سے سلام کیا.. دوسرے ہاتھ سے وہ ڈوری میں بندھی ہوئی جل مرغی کو ایک منہ زور ہوا کی زد میں آتی ہوئی پتنگ کی طرح تھامے رہا..

"سائیں آؤ کھیل کرو..." جس ہاتھ سے اُس نے سلام کیا تھا اُسی ہاتھ سے وہ اپنے گرتے ہوئے تہبند کو سنبھالتا اُس کے پاس آ گیا اور ڈوری اُس کی جانب بڑھا دی جیسے ماہر پتنگ باز کسی اناڑی پر مہربان ہو کر ڈور اُسے تھمانے کے لئے آگے کرتے ہیں کہ... ذرا دیکھو کیسی تنی ہوئی ہے..

جل مرغی ہمت نہیں ہارتی تھی.. ڈبکی لگاتی تھی اور باہر آنے پر اپنے پنجے میں بندھی الجھن کے باوجود تیرنے کی کوشش کرتی تھی..

وہ اُس پاگل خانے سے مختلف نہ تھی... شائد وہی تھی.. اُس کے پنجوں سے بندھی

ڈوری اُس کے گھر خاوند اور بچوں کے ہاتھوں میں تھی لیکن اس کے باوجود وہ ڈبکی لگا کر آجاتی تھی.. زیرو پوائنٹ کی بلندی میں تادیر زیر آب رہتی تھی کہ شائد آزاد ہو جائے... وہ ڈبکی لگاتی تھی تو اُس کی غلافی آنکھیں پانیوں میں تیرتی تھیں..

عطااللہ نے اُس کی ہچکچاہٹ کو محسوس کیا اور پھر اپنی توند سے کھسکتا تہبند اوپر کر کے دونوں ہاتھوں سے ڈوری کھینچنے لگا.. جل مرغی کی چونچ اور پورے وجود کا رُخ کھلے پانیوں کی جانب تھا لیکن وہ بے بس واپس کنارے کی طرف کھنچتی چلی آتی تھی.. ڈوری کے تناؤ میں ذرا سی ڈھیل آنے پر وہ پھڑ پھڑا کر پھر تیرنے کی سعی کرتی اور پھر لاچار ہو کر بے جان سی ہو جاتی... کنارے کے قریب آتی جاتی اگرچہ اُس کی چونچ اور آنکھیں کھلے پانیوں کی جانب ہی ہوتیں..

نسل انسانی کے نصیب کی چونچ اور آنکھیں بھی اگرچہ کھلے تا حد نظر پھیلے پانیوں کی وسعت پر تھیں لیکن اُس کے پنجوں میں بندھی ایک ڈوری تھی جو اُسے کسی اور جانب کھینچتی تھی..

کوئی تھا جو لُک چُھپ لُک چُھپ ڈور کھینچتا تھا..

اور ہم یہی کہہ سکتے تھے کہ جو چاہو ہو سو آپ کرے ہو... بے بس تھے.. چونچ پانیوں کی سمت کیے اپنے تئیں اُدھر تیرتے تھے.. آزاد ہوتے تھے.. لیکن نامعلوم انداز میں کھنچے چلے جاتے تھے واپس اُس کنارے کی جانب جہاں ایک موٹا بدھا ہمیں آج رات الاؤ پر بھوننے کے منصوبے بناتا تھا..

فہیم جھومر ڈال رہا تھا..

ریت میں اُس کے پاؤں دھنستے تھے لیکن جعفر کے گھڑے کی تال سے وہ مست ہوتا تھا.. سرور کی پرات کی تھاپ پر وہ الست ہوتا تھا اور بھڑکتے ہوئے بچ کی روشنی میں جھومر ناچتا وہ قونیہ کے گھومتے ہوئے درویشوں کی سنگت میں مست الست ہوتا تھا.. ساوی نے اثر کر دکھایا تھا..

عطااللہ بچ کے الاؤ کی قربت میں ہو بیٹھا.. آلتی پالتی مارے بیٹھا اُس کی آگ میں اپنی جل مرغی بھونتا تھا اور اُسکے ہونٹ گیلے ہوتے تھے..

کچھ دور بیٹھی پکھی.. اپنے بڑے اور بھاری کولہوں پر بیٹھی.. چپ بیٹھی.. لیکن وہ سب سے بڑھ کر بولتی تھی چپ بیٹھنے کے باوجود!

ابھی تک پکھی کے ہاتھوں کی اُپلوں کی آگ پر پکائی ہوئی موٹی روٹی کا سواد خاور کے منہ میں تھا اور جس میں دھوئیں کا ذائقہ بھی تھا اور پکھی کے سیاہ ہاتھوں میں سے بھی کوئی مہک اُس میں شامل ہو گئی تھی.. اُس نے پکھی نے کوئی نہ کوئی بس گھولا تھا' ٹونا کیا تھا اُس روٹی پر کہ وہ اپنے تالو کے نیچے اُس کے بدن میں سے پھوٹنے والے پسینے کی نمکین کیفیت کو محسوس کرتا تھا..

سرور نے سر جھکا کر گھڑے پر بندھے ململ کے کپڑے پر جمے آٹے پر سے اپنے ہاتھ اُٹھائے اور ایک دریائی گینڈے کی طرح پورا منہ کھول کر گانے لگا.. وہ تالو تک سیاہ تھا اور اُس کے مسوڑھے بھی کالے شاہ تھے..

پُرایں موسم تیکوں بیڑی تیں میں پار دی سیر کرائی ہی
بہوں چس آئی ہی...

جب وہ پہلے مصرعے کی تان اُٹھانے کے بعد "بہوں چس آئی ہی.." پر آیا تو ماماں جعفر نے بھی یکدم جبڑا کھول دیا اور وہ مل کر گانے لگے..

پار کی سیر...

کوئی بھی اپنی مرضی سے پار کی سیر کو نہیں جاتا' اُسے بھیج دیا جاتا ہے..

ان برسوں میں پار کی سیر قربت میں محسوس ہوتی تھی..

اُس کی بیڑی بھی دھیرے دھیرے ہر سانس کے ساتھ دوسرے کنارے کی جانب ٹھل رہی تھی اور یہ قیاس کسی کے بس میں نہ تھا کہ وہ جان لے کہ یہ کونسے لمحے ایک دھچکے کے ساتھ دوسرے کنارے جا لگے گی... ہو سکتا ہے اگلے لمحے میں اور ممکن ہے کہ دو چار برس بعد.. پار تو بہر طور پر اُترنا تھا... پار کیا تھا؟ یہ آج تک کسی کی فہم میں نہیں آیا.. کوئی نہیں جان پایا... پار جانے والے کسی ایک نے بھی آج تک خبر نہیں کی کہ پار کیا ہے....

سندھ ساگر کا یہ ٹاپو جس پر فہیم جھومر ڈالتا مست الست ہوتا تھا اور سرور اور جعفر گلا پھاڑ پھاڑ کر تانیں بلند کرتے تھے.. دریا کی دو شاخوں کے درمیان میں کسی وہیل کے کوہان کی طرح ابھرا ہوا تھا اور سائز میں بھی اُس سے کچھ زیادہ بڑا نہ تھا.. اس کا رقبہ پانچ چھ مرلے سے زیادہ تو نہیں لگتا تھا.. اُس پر وہ پانچ تھے جو مُقیم تھے' ایک خیمہ اور ایک الاؤ.. کوئی ایک اور ہوتا تو اُس کے بیٹھنے کی جگہ مشکل سے بنتی..

آج رات کرنے کے لئے سرور ایک بہت بڑے جزیرہ نما بیلے کے کنارے سے جا لگا تھا جو سروٹوں' کاہی اور قد آدم گھاس سے گھنا اور ڈھکا ہوا تھا.. اس کے درمیان میں کہیں دھن وال اپنے کچے کوٹھوں میں بسیرا کرتے تھے اور وہ بیلے میں اپنے مال ڈنگر چراتے تھے اور باہر کی دنیا سے غرض نہ رکھتے تھے.. اور اس بیلے کو صرف ساون کے مہینوں میں چھوڑتے تھے جب کاہی اور سروٹ چڑھتے پانیوں میں ڈوب جاتے تھے اور اُن پر سندھ ایسے بہنے لگتا تھا کہ کسی کو شک بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کے نیچے تہہ میں سروٹوں کے جنگل اور کچے کوٹھے ہیں جو پانی میں گھلتے ہیں... ساون میں بقول سرور... سندھ سُوکتا ہے سائیں.. اپنے آپ میں کسی شے کو اُترنے نہیں دیتا نہ کشتی کو نہ آدم کو.. اور جو اُترے اُسے کبھی زمین پر واپس نہیں جانے دیتا... پانی اُترنے پر یہ دھن وال واپس آتے تھے اپنے مال مویشی کو کشتیوں میں سوار کر کے اور کوٹھے دوبارہ تعمیر کر لیتے تھے۔ اُن کی اِن پانیوں کے بیچ آباد بستیوں کو بھاناں کے نام سے جانا جاتا تھا..

اگرچہ جس مقام پر اُن کی کشتی ٹھہری تھی اور جہاں سرور رات کرنا چاہتا تھا وہاں سے وہ بھاناں بہت دور تھا.. صرف کبھی کبھار ڈنگروں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی مدھم سی آواز آتی تھی لیکن سندھ میں بسر کی جانے والی کسی بھی رات میں خاور اُس قطعہ زمین پر اس شاہے سے بھی اُلجھن میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ وہاں آس پاس کوئی اور بھی ہے' بے شک بہت دور ہے لیکن کوئی ہے.. اُسے اپنا خود مختار جزیرہ درکار تھا..

"یہاں نہیں سرور.."

"کیوں سائیں.. اچھی جگہ ہے.."

"جب بھی رات کرنی ہے تو ایسی جگہ جہاں آس پاس آدم ہو نہ آدم زاد... اِدھر سے چلو.."

"کدھر سائیں؟" اُس نے بے دلی سے جھلائی ہوئی آواز میں کہا.. کہ اُسے آس تھی کہ وہ گلہ بانوں کے ڈیرے پر جا کر آج رات دودھ کا ایک گھڑا مانگ لائے گا.. مکھن کا ایک پیڑا حاصل کر لے گا اور اُس پر صاحب کی چینی چھڑک کر نگلے گا تاکہ اُس کی آنتیں جو دھوپوں اور فاقوں اور دریا برد ہونے والی بستی میں سے کشتی کھینچتے خشک اور مروڑی جا چکی تھیں' چکناہٹ سے تر ہو جائیں' نرم ہو کر اُن کی گانٹھیں کھل جائیں..

"کہیں بھی.. جہاں اور کوئی آدم نہ ہو.."

سرور نے بانس اُٹھا کر پانی میں ڈالا اور اُس پر اپنا سینہ رکھ کر کشتی کو کنارے سے جدا کیا.. اور اُسی لمحے خاور کو افسوس ہوا.. اُس نے ایک وہم میں' ایک عجیب خبط میں اُسکے تھکے ہوئے بدن کو خواہ مخواہ پھر سے مشقت کرنے پر مجبور کر دیا تھا.. یہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی ترنگ تھی لیکن اُس کی خصلت کی مجبوری تھی..

ماماں جعفر بھی بیزار ہو کر پچھلے حصے میں جا بیٹھا اور بوٹی کا کچا کھول کر اُس میں سے گہرے گھونٹ بھرنے لگا..

عطاءاللہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ نتھی ہو گیا تھا اور جل مرغی کے ساتھ تماشہ کرنے کے بعد اُسے حلال کر چکا تھا..

رات ہونے والی تھی جب پانیوں کے درمیان ایک سیاہ اُبھار نظر آیا.. وہ دور سے ایک جھاڑی سی دکھائی دیتی تھی یا ایک بڑا سارا پتھر جو بہاؤ کے درمیان میں سے سر اُٹھاتا تھا پر وہ پانیوں کی چار میں سے نمودار ہوتا ایک مختصر سا ریتلا ٹاپو تھا..

"سرور... یہ جگہ کیسی ہے؟"... وہ واقعی ایک وہیل کی پشت سے زیادہ بڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی کچھ دیر کے لئے سانس لینے کو اُبھرا ہے اور ابھی پانی میں غرق ہو جائے گا..

"کیا پتہ کیسی ہے سائیں.." اُس کے لہجے میں ناپسندیدگی سے آگے نفرت کی ایک چنگاری کا شائبہ ہوتا تھا "میں تو پہلے ادھر نہیں آیا.... آیا ہوں تو یہ پہلے ادھر نہیں تھا.."

"ادھر رات کر لیں؟"

"بہت چھوٹا ہے سائیں.. ادھر رات کریں گے تو کیا پتہ رات کی رات سندھ سائیں کے پانی چڑھ آئیں اور مشکل ہو جائے.. اس پر تو آپ کے تنبو لگانے کے لئے بھی جگہ دکھائی نہیں دیتی.. پر آپ مالک ہو.. حکم کرو"

"تم لے چلو.. رات ادھر ہی کرتے ہیں.. میں کشتی میں سو جاؤں گا"

وہ ٹاپو حقیقت میں اتنا ہی مختصر تھا کہ جب اُن کی کشتی اپنے زور میں اُس کی ریت کے اندر تک گئی تو اُس کا دل رُک گیا کہ یہ ابھی اسے دھکیل کر پانیوں میں گرا دے گی...

اور اب رات کی سیاہی میں وہی ٹاپو تھا جس پر فہیم جھومر ڈالتا تھا..

اور اس لمحے اگر سندھ کی گہری تاریک رات میں پانیوں پر کوئی بادبانی کشتی دور سے

گزرتی جاتی تھی تو اُس میں اونگھتا کوئی شخص اگر گھٹاٹوپ اندھیرے میں یونہی ادھر نظر کرتا تو یقیناً ششدر رہ جاتا.. اُسے اور کچھ نظر نہ آتا.. صرف پانیوں کے تاریک پھیلاؤ میں ایک الاؤ کی روشنی میں جھومر ڈالتا ہوا فہیم دکھائی دیتا.. جیسے وہ پانیوں پر ناچتا ہو.. اُسے اُس بادبانی کشتی میں سوار اونگھتے ہوئے شخص کو وہ کوہان نما ناپو تو دکھائی نہ دیتا.. صرف فہیم کا نیم روشن بھوت گردش میں نظر آتا... اور وہ یقیناً اِس منظر کو نظر کا دھوکا سمجھتا.. کوئی آفت یا کرشمہ سمجھتا.. کہ ایک شخص بہت دور پانیوں کے تاریک پھیلاؤ میں رقص کر رہا ہے اور ڈوبتا نہیں...

اُس کی گزشتہ زندگی کے تھیٹر میں جتنے بھی کردار تھے.. اُس کی تینوں بیٹیاں.. دوست احباب... ٹیلی ویژن کے رفیق... کبھی اپنے بے حد بے مہار تصور میں بھی یہ نہیں لا سکتے تھے کہ وہ... اس لمحے.. جب وہ زرد شیطان کے شہروں میں ڈالروں کی آرزو اور حصول کے لئے نڈھال ہوتے تھے' اپنے ڈرائنگ رومز میں ٹیلی ویژن کے سامنے اونگھتے تھے یا اپنی بیویوں کے بوڑھے بدنوں سے منہ موڑ کر سوتے تھے.. وہ تصور کے آخری سرے پر چلے جانے کے باوجود یہ خیال نہیں کر سکتے تھے کہ وہ... خاور.... اِس لمحۂ موجود میں جب گھڑی پر اتنے بج کر اتنے منٹ ہوئے ہیں وہ سندھ ساگر کے ایک ایسے ناپو کی رات میں ہے.. جہاں آج تک کسی نے رات نہیں کی.. اُس کے سامنے فہیم جھومر ڈال رہا ہے.. ماماں جعفر بوئی کو اپنے سے بڑھ کر پی گیا ہے اور اب ذرا احتیاط سے حرکت کرتا ہے کہ کہیں لڑھک نہ جاؤں.. اور اگر لڑھکوں گا تو سیدھا سندھ میں جاگروں گا اور بہہ جاؤں گا.. ایک مونا بدھا الاؤ پر جل مرغی کو بھونتا اور پلٹتا ہے.. پکھی ناپو کی کم مائیگی کے باعث بہت قریب بیٹھی ہے اور اُس کی حدت سے گلیشیر پگھل سکتا ہے.. اور سرور اپنے حال میں مست... صاحب کے لئے اپنی بیزاری بھول چکا ہے اور منہ کھولے گا رہا ہے..

داساں کہیں بے دیس دے واقف نئیں
بس بیڑی پانی دیس ای اپنا دیس اے...
پانی دیس کی رات میں...

پانی دیس کے باسی... اور اُن میں صرف ایک الگ اور غیر ذات... جسے وہ روٹی پانی کے لئے برداشت کرتے تھے اور ابھی تک یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ادھر کیوں آیا ہے.. نہ پنکھ پکھیرو کو اور نہ پکھی کو ڈھانے آیا ہے تو کیوں آیا ہے.. اور یہ کب تک بے وجہ اسی طور بیڑی

میں ٹھلتا رہے گا.. اس کا کونسا ٹھکانہ ہے اور اس نے جانا کہاں ہے.. نہ پرندوں کے پیچھے جاتا ہے نہ دارو پیتا ہے اور نہ مچھی کو اُن نظروں سے تکتا ہے جن نظروں سے سب سائیں لوگ اُسے کشتی میں سوار ہوتے ہی تکتے تھے..

لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اُس کی نظروں میں فتور آرہا تھا.. وہ اُنہی نظروں سے اُسے تکتا تھا اُس کی جانب دیکھے بغیر اُسے تکتا تھا.. اور ذرا پرے بیٹھی مچھی کے کولہوں تلے جو اُن کے بھار سے ریت کھسکتی تھی تو اُس کے ایک ایک ذرّے کے ساتھ وہ بھی سرکتا تھا..

فہیم کے جھومر قدم تھکنے لگے.. وہ نڈھال ہو کر اپنے بے قابو اور مست سانسوں کو سنبھالتا ریت پر گر گیا..

وہ منظر سے ہٹا تو سرور نے اپنے گھڑے سے ہاتھ اُٹھالیا.. اور جعفر نے پرات کو پرے کر دیا.. اور سندھ کی شب سیاہ کا سناٹا جو اُن کے شور سے ٹاپو کے باہر پانیوں میں دُبکا بیٹھا منتظر تھا دندناتا ہوا اُن پر وارد ہو گیا اور وہ سب اُس کی چپ آغوش میں چلے گئے اور ہر ہستی جدا جدا ساکت ہو گئی...

ٹاپو پر اُترتے ہی ماماں جعفر نے کہا تھا "مچ لگائیں سائیں؟"

پانی کے یہ پُونگ بوٹی پینے کے علاوہ مچ لگانے کے بے حد شوقین تھے..

"ادھر تو لکڑی نہیں ہے جعفر..."

"ساتھ لے کر آئے ہیں سائیں.. رات کو مچ نہ لگائیں سائیں تو پانیوں کے اندر جو بھوت پریت اور بلائیں بسیرا کرتی ہیں ناں تو وہ سب ٹاپو پر آکر رات کرنے والوں کے لئے جنجال بن جاتی ہیں.."

یہ مچ بھی اب راکھ ہونے کو تھا جب سندھ کا سناٹا اُن پر غالب آیا تھا..

فہیم ابھی تک ہانپ رہا تھا..

ماماں جعفر بہت تردد اور احتیاط کے ساتھ اُٹھا اور اُس کے سامنے بوٹی کا کچار کھ دیا... فہیم نے اُسے منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور بحال ہو گیا..

"بہت زبردست جھومر ڈالتے ہو فہیم..." اُس نے مناسب سمجھا کہ اُس کی شدید اور لگاتار مشقت کی حوصلہ افزائی کی جائے "زبردست..."

"جھومر تو یہ قبروں پر ڈالتے ہیں سائیں.." ماماں جعفر نے اُٹھنے کی کوشش کی اور

ریت میں پاؤں دھنس جانے سے لڑکھڑا کر پھر وہیں ڈھیر سا ہو گیا۔ "اور سائیں ننگ دھڑنگ ہو کر"

"قبروں پر؟"

"جی سائیں۔۔ یہ ڈڈا پارٹی کے ممبر ہیں ناں۔۔۔ یٹرگ پارٹی کے۔۔۔ راتوں کو ویرانوں میں اور قبرستانوں میں جا کر ننگے پنگے جھومر ڈالتے ہیں سائیں۔۔"

"کیوں فہیم؟"

"نہیں نہیں صاحب۔۔" فہیم بوٹی کا پورا کچا چڑھانے کے باوجود فوراً ذی ہوش ہو گیا "یونہی خبر اڑ گئی ہے کہ۔۔ ہم لوگ مٹرول شریف کا ورد کرتے ہوئے قبروں کے گرد کپڑے اُتار کر ناچتے ہیں۔۔۔ یونہی ہوائی بات ہے۔۔ یٹرگ پارٹی کے لوگ ذرا زندہ دل ہوا کرتے تھے۔۔ یٹرگی کہلاتے تھے تو ذرا دل لگی کو اور من کا رانجھا راضی کرنے کو ایسے کسب کیا کرتے تھے۔۔۔"

"بوٹی پی کر ایسے کسب کرتے تھے؟"

"بوٹی بنا تو ایسے کام کہاں ہو سکتے ہیں سائیں۔۔۔ پر سنجیدہ بات نہیں تھی، تھوڑا کھیل تماشہ تھا۔۔ پر اب یٹرگ پارٹی نابود ہو چکی ہے۔۔"

"تم اس کے ممبر تھے؟"

"نہیں سائیں یونہی خبر اڑ گئی ہے۔۔" فہیم ڈولتا ہوا سندھ میں ڈولتی ایک کشتی کی مانند ڈولتا ہوا اُٹھا" آپ کی اجازت سے میں ذرا اپنے آپ کو خالی کر آؤں۔۔۔ بہت بھر گیا ہوں" وہ چند قدم آگے ہوا تو اُس کا پیر پانی میں گیا اور وہ فوراً اپنے آپ کو سمیٹ کر پیچھے ہو گیا "سرور یہ رات کرنے کے لئے تم کیسے ٹاپو میں لے آئے ہو۔۔۔ پکھی کی چھاتی جتنا۔۔"

سرور خوش ہو گیا "میں تو نہیں لایا۔۔۔ مالک ادھر لے آیا ہے"

فہیم چپ ہو گیا اور اپنے آپ کو خالی کرنے کے ارادے سے تائب ہو کر پھر الاؤ کی راکھ کی قربت میں آ بیٹھا" پھر تو سائیں آج کی رات تو آنکھوں میں کٹے گی۔۔ آنکھ لگ گئی تو ایک کروٹ بدلنے سے سندھ میں بہہ جائیں گے۔۔۔ میں تو بیٹھ کر رات کرتا ہوں" اُس نے ٹانگیں جوڑ کر اُن کے گرد بازوؤں کا حلقہ کیا اور اسی حالت میں رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔۔

جب سے سفر کا آغاز ہوا تھا۔۔ کب سے۔۔ اس کا کچھ حساب کتاب اور سراغ نہیں ملتا تھا۔۔ تب سے خاور نے پہلی مرتبہ بجھتے ہوئے الاؤ کی لو میں کنارے کے ساتھ جُڑی

مہانوں کی کشتی کو غور سے دیکھا.. وہ اپنا گلا دھڑ ریت میں دھنسائے اور پچھلے حصے کو دریا کے پانیوں میں ٹھہرائے سجے سجے تاریکی میں ڈولتی حرکت کرتی تھی.. اور اُس کے چوبی بدن پر نہایت دل کش اور رنگین نقش و نگار تھے..

"سرور..."

"جی سائیں..." وہ ہڑبڑا کر بولا..

"یہ کشتیاں تم خود بناتے ہو؟"

"نہیں سائیں.. ہم مہانے تو انہیں کھینا جانتے ہیں بنانا نہیں جانتے.... لیہ کے گاؤں لسکانی والا میں کاریگر ہیں جنہیں گھاڑو بنانے والے بولتے ہیں بس وہی بنا سکتے ہیں...

بھلے وقتوں میں تو سنا ہے کہ لکڑی کا خرچہ ہوتا تھا اور کاریگر روٹی پانی کے ساتھ بنا دیتا تھا پر اب تو نکمی کشتی بھی ڈیڑھ دو لاکھ سے کم میں نہیں آتی.. کالا باغ میں ایک کاریگر ہے رضا نام کا.. پر بد دماغ ہے بہت.. پر کشتی بناتا ہے تو ایسی کہ حور پری لگتی ہے.. طالب حسین بھی بڑا ماہر ہے پر اب دریا چھوڑ گیا ہے تونسہ جا کر پکے مکانوں میں رہنے لگا ہے.. کشتی جب تیار ہو جاتی ہے ناں سائیں تو بڑا موج میلہ ہوتا ہے.. کاریگر کو سہرے باندھ کر کشتی کو اُس کے سمیت پانی میں دھکیلتے ہیں دیکھنے کے لئے کہ کہیں ڈوبی تو نہیں کھڑی اور جب تیرنے لگتی ہے تو سب مبارکباد کرتے ہیں اور کاریگر کو سہروں سمیت پانی میں دھکا دے دیتے ہیں.. یہ رسم ہے سائیں.. اور پھر سب مل کر بوٹی پیتے ہیں اور دریا اور کشتیوں کے گیت گاتے ہیں.. ماماں جعفر ہوئے.."

ماماں جعفر اونگھ گیا تھا سرور کی ہوئے سن کر ہڑبڑایا اور کہنے لگا "سرور یوں یکدم تراہ نہ نکالا کر.. میں تو ناپو سے لڑھک کر پانی میں گرتا کھڑا تھا.."

مچ بہت دیر سے سرد ہو چکا تھا.. اندھیرا نہ دیکھتا تھا نہ قیاس کر سکتا تھا نابینا تھا.. لیکن وہ ایک دوسرے کے چہروں کے اتنے آشنا ہو چکے تھے کہ اُن کے خدوخال نابینائی کے باوجود تاریکی میں سے نمایاں ہوتے تھے... جیسے وہ ایک زیرِ زمین گھپ اندھیری کوٹھڑی میں بند ہوں اور پہرے دار ایک مشعل اُٹھائے کب کا وہاں سے گزر چکا ہو لیکن پھر بھی روشنی اُن کے ناک نقشے پر ٹھہر گئی ہو اور وہ ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہوں..

بے نام غلافی آنکھوں کی کوٹھڑی کی مانند.. خاور ریت کو اُنگلیوں سے کریدتا تھا.. اُس نے کوئی اتنا بڑا جرم نہیں کیا تھا.. صرف ایک جراب اور ایک بوٹ اتارنے کو کہا تھا.. اور

جہاز سے نکلتے ہی اتنی پشیمان ہوئی تھی کہ مالک سے باندی بن گئی تھی.. پاؤں پڑنے کو تیار تھی.. وہ کیسے نارمل ہو سکتی تھی اگر اُس کی پوری زندگی ایک انارمل چاہت کے حصول کے لئے گزری تھی.. اُس نے اتنا بڑا جرم نہیں کیا تھا.. خاور کا ردعمل ایک معمول کی صورت حال میں تو قابل فہم تھا لیکن وہ تو پاگل پن کی غیر معمولیت کا شکار تھی.. نفسیاتی مریضوں اور ذہن میں فتور رکھنے والوں کو جرم کی سزا نہیں دی جاتی... وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا.. اُس کی کمی کو شدت سے محسوس کرنے لگا..

گئی رات میں وہ کشتی کے اندر... کہ باہر ناپو پر اُس کے خیمے کے لئے جگہ نہیں تھی.. کروٹیں بدلتا رہا.. شدید احساس جرم کا شکار رہا.. اُن گدوں اور غلیظ رضائیوں میں جن پر بل جل کا ایسا کام ہو چکا تھا کہ کشتی کناروں سے ٹھک ٹھک ٹکراتی تھی.. باہر ناپو پر پکھی کے بھاری کولہوں تلے ریت سرکتی تھی کسی بھار کے باعث اور ریت کا ہر ذرہ جب کھسکتا تھا تو اُس کی چبھن سے اُس کا بدن ٹھٹھکتا تھا... اُس نے ایک اور کروٹ بدلی...

پپوٹوں پر ایک ہلکی روشنی سی تیری.. خاور نے آنکھیں کھول دیں.. کشتی کا اندرون روشن ہو رہا تھا.. آوازوں کی ہلکی بھنبھناہٹ آ رہی تھی.. لوگ باتیں کر رہے تھے ہنس رہے تھے.. پانیوں کے بلوئے جانے کی ایسی گہری اور گونجدار سرسراہٹ تھی جیسے سندھ کے سینے میں ایک بہت بڑی مدھانی اُتری ہوئی ہے جسے طاقتور ہتھیلیاں گھماتی ہیں... پانی تلاطم میں تھے اور شور کرتے تھے..

کشتی کے اندر روشنیاں پڑتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں اور پھر جھولتی ہوئی ہر شے کو روشن کرتی تھیں... خاور کی نگاہ کیل کے ساتھ ٹنگے پلاسٹک کے فریم والے آئینے تک گئی.. اُس میں انڈس کوئین تیرتی تھی.. اور اُسی لمحے اُسے خالی کر گئی..

کشتی کا اندرون پھر سے اندھیرے میں ڈوب گیا.. بلوئے گئے پانی پھر سے ہموار ہو کر چپ میں چلے گئے.. صرف ایک کرلاتی کونج کی... اکیلی کونج کی کرلاتی ہوئی چیخ سنائی دی اور وہ بھی چپ میں چلی گئی..

لیکن آئینے کی تاریک سطح پر ایک جل مرغی کی شبیہہ اُبھرتی تھی جو پھڑ پھڑاتی ہوئی تیرتی تھی اور اُس مقام سے آگے نہ جا سکتی تھی کہ نجات اُس کے نصیب میں نہ تھی.. ایک ڈوری اُس کے پاؤں میں بندھی ہوئی تھی جس سے وہ پیچھے ہی پیچھے کھنچی چلی جاتی تھی..

کشتی کے دونوں جانب بلند کنارے تھے اور وہ نہایت سہمی ہوئی اُن کے درمیان..
اتنی خاموشی سے بہتی ہوئی جارہی تھی کہ زیرِ آب اگر کوئی ڈولفن تھی تو اُسے بھی خبر نہ ہو سکتی تھی کہ پانی کے سینے پر سے کوئی شے گزرتی ہے..

کنارے اونچے تھے اور اُن پر لائی اور سروٹوں کے گھنے ذخیرے تھے..

اتنے گھنے کہ صبح کی مدھم ہوا اُن کے اندر جانے کی کہیں گنجائش نہ پاتی تھی اور اُن کے اوپر سے سرسراتی گزرتی تھی... وہ سب کے سب اُن کے تیز دھار والے پتے اور آپس میں گتھی ہوئی شاخیں بے حد ساکن' چپ سکوت میں' بے حس و حرکت خاموش کسی سامری کے سحر میں پھونکے ہوئے لب بستہ تھے کہ ہوا اُن کے اندر نہ آسکتی تھی کہ وہ سرگوشیاں کر سکتے اور دونوں کناروں کے بیچ ایک چوڑی آبی گزرگاہ تھی.. ایک نہر تھی اور وہ بھی ہموار اور خاموشی کے طلسم میں تھی اور اُس کے سناٹے میں دم بخود اُن کی کشتی تھی جو بے آواز اُس میں سے گزرتی تھی۔

تہہ در تہہ گھنے کنارے اُس کچھ یکدم ظہور پذیر ہو جانے والی خاموشی سے حاملہ تھے جس میں سے ہارٹ آف ڈارکنیس کی مانند اس سکوت کو توڑتے وحشی قبائل برآمد ہو کر کشتی پر زہر آلود تیروں اور بھالوں کی بوچھاڑ کر سکتے تھے..

عجیب سا ٹھہرا ہوا گمشدہ سناٹا تھا جس میں اُن کی کشتی ایک ہموار رفتار سے آگے بڑھتی جاتی تھی..

خاور کشتی کی نوک پر کھڑا سویر کی ہوا کو اپنے سینے پر محسوس کرتا ہوا.. ایسے کہ پوری کشتی اُس کی پشت پر تھی اور گویا صرف وہ تھا جو پانیوں کا سینہ چیرتا آگے چلا جاتا تھا..

ایک سمندری جہاز کے آگے نصب کسی دیوی کے اُس مجسمے کی مانند جو نمکین پانیوں کی پھوار اپنے بدن پر سہتی ہے اور اُسے کچھ علم نہیں ہوتا کہ اُس کی پشت پر جو جہاز چلا آتا ہے اُس کے مکین کون ہیں اور اس لمحے کیا کر رہے ہیں.. اُس کا مدمقابل صرف سمندر ہوتا ہے..

اُس نہر کے خاتمے پر.. جہاں دونوں کنارے اختتام کو پہنچ رہے تھے ایک بے انت پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا جو انڈس کا مرکزی دھارا تھا اور یہ نہر دریا کی ایک بڑی شاخ کو اس دھارے سے جا ملاتی تھی۔ وہ بڑی شاخ کہیں بہت آگے جا کر بل کھاتی ہوئی اگرچہ اسی دھارے میں جا شامل ہوتی تھی لیکن یہ نہر ایک شارٹ کٹ تھی.. اور وہ اُس شاخ سے الگ ہو کر اس کی تنکنائی میں داخل ہو گئے تھے اور اس میں یونانی دیومالا کی کسی ایسی کشتی کی طرح رواں تھے جس کے آس پاس کے جنگلوں میں سے کسی بھی لمحے ڈائنیں اور چڑیلیں برآمد ہو سکتی تھیں یا خاموش پانیوں میں سے کوئی یک چشم عفریت اُبھر سکتا تھا..

وقت کا یہ لمحہ اور یہ بھید بھری چپ سینکڑوں برس پیشتر کا افریقہ بھی ہو سکتی تھی... پارٹ آف ڈارکنیس.. جاوا سماٹرا کے اُلجھے ہوئے گھنے جنگلوں میں اُترتی مگرمچھوں سے کلبلاتی کوئی ندی بھی ہو سکتی تھی.. لیکن ایک فرق تھا.. کناروں کے گھنے ذخیروں میں سے کسی انجان پرندے کی کوک سنائی نہ دیتی تھی.. اور نہ کسی لگڑ بگڑ یا دل کو دہلا دینے والی کسی جنگلی جانور کی آواز آتی تھی اور نہ ہی ڈھول کی مدھم تھاپ کوئی پیغام مرگ بھیجتی تھی.. بس سناٹا تھا اور گھنی چپ تھی اور وہ ایک ویران خواب کے آبی سناٹے کے اندر چلے جاتے تھے... پچھلی شب کے مسلسل جھومر ڈالنے سے فہیم کا بدن تھک ٹوٹ چکا تھا اور وہ بے سُدھ نیند میں گم تھا..

کشتی کے پچھلے حصے میں پکھی براجمان تھی اور وہ کچھ نہ دیکھتی تھی کہ اُس کے آس پاس کیا گزرتا ہے' اتنی چپ کیوں ہے.. وہ جیسے غازی گھاٹ کے پل کے نیچے بے پرواہ بیٹھی تھی اور وہ سنگھاڑا مچھلی صاف کر رہی تھی جو آج سویرے اُس مختصر ٹاپو کی خصوصی عنایت سے سرور کے جال میں آ گئی تھی... اور سرور نے بھی کل اس کشتی کو دریا برد ہونے والی بستی کے کھیتوں اور صحنوں میں کاندھے پر رسہ ڈالے بہت دیر کھینچا تھا.. پھر شاید پچھلی شب بھی اُس نے پکھی کے کولہوں تلے سے ریت سرکانے میں بہت مشقت کی تھی تو وہ اُس کے قریب ایک گدے میں سمٹا ہوا منہ کھولے سو رہا تھا..

عطااللہ اُس کے قدموں میں ڈھیر تھا... اُس کی توند پانیوں میں سے اُبھرنے والی کسی سیاہ رنگ کی وہیل کی طرح اُٹھتی تھی اور نیچے ہو جاتی تھی.. وہ بھونی ہوئی جل مرغی کی ہڈیاں تک چبا گیا تھا...

ماماں جعفر چوڑے چپو کے ساتھ بہاؤ کے زور میں آئی ہوئی خود بخود رواں کشتی کی سمت کا دھیان کر رہا تھا..

کشتی کی نوک پر کھڑے ہوئے اُسے لگتا تھا کہ اُس کے پاؤں تلے کچھ بھی نہیں' وہ ہوا میں ساکت ہے اور وہ تنہا اس آبی گزرگاہ کے درمیان میں معلق ایک ہی مقام پر کھڑا ہے لیکن دائیں بائیں جو اونچے کنارے ہیں صرف وہ دھیرے دھیرے سرکتے پیچھے رہتے جاتے ہیں اور نہر کی تنکنائی اُس پر حاوی ہوتی جاتی ہے.. اب تک کے سفر میں اُس نے سندھ کے پھیلاؤ میں کھلے سانس لئے تھے جن کی کوئی حد نہ تھی کوئی روک ٹوک نہ تھی لیکن اب دونوں جانب سرحدیں تھیں اور درمیان میں پانی کی ایک چوڑی پٹی کی ریاست تھی اور ویران تھی..

اُسے اُلجھن ہونے لگی کہ یہ چپ کیوں نہیں ٹوٹتی.. کوئی ایک پرندہ ہولے سے کوک دے.. کوئی جھینگر ٹرائے.. صرف ایک مچھلی سطحِ آب میں سے کود کر باہر آئے اور پھر شپاک سے گم ہو کر کوئی دائرہ اپنے وجود کا چھوڑ جائے..

سویر کی دُھوپ میں گئی رات کے سناٹے یہاں سفر کے رفیق تھے..

وہ پانیوں کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا..

کسی یونانی دیوی کے مجسمے کی مانند.. بت بنا.. سمندر کو اپنی جانب لپکتا ہوا دیکھتا.. اور بے شک اُس کے عقب میں جو جہاز تھا اُس میں سینکڑوں افراد سوار ہوں.. بال رُوم میں رقص کرتے شور مچاتے ہوں.. ڈائننگ ہال میں گلاسوں اور چھری کانٹوں کی چھنک گونجتی ہو.. دھڑکتے دل اور خوبصورت چھاتیاں ہوں لیکن وہ اُن سے بے خبر ایک گارڈین اینجل کے کردار میں جہاز کی نوک پر کھڑا ہوا... اُس کے چہرے کو نمکین پانیوں کے چھینٹے بھگوتے ہوں اور وہ اُنہیں پونچھ بھی نہیں سکتا تھا.. اس لئے کہ وہ محض ایک مجسمہ تھا..

اور سمندر کے مقابلے میں تھا..

اُس کے ایک جہاندیدہ اور عملی رجحان رکھنے والے دوست کا کہنا تھا کہ ایک

عورت کو' کسی بھی عورت کو اپنی جانب متوجہ کرنے اور اکثر اوقات اُسے اپنی محبت میں گرفتار کر لینا محض ایک باضابطہ اور میکانکی عمل ہے.. اس کے لئے خوش شکل ہونا' متاثر کرنے والی شخصیت یا ذہانت وغیرہ قطعی طور پر درکار نہیں... صرف پرچہ ترکیب سامنے رکھ کر اُس پر شق در شق عمل کرتے جانا ضروری ہے... کوئی بھی مناسب شخصیت کا حامل مرد اگر شطرنج کے مہروں کی طرح ذرا سوچ سمجھ کر ایک طے شدہ ضابطے کے تحت چالیں چلتا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مطلوبہ نتائج بر آمد نہ ہوں... بلکہ کومات نہ ہو..

ظاہر ہے یہی ضابطے' یہی چالیں صنف نازک بھی آسانی سے اپنا سکتی ہے اور بادشاہ کو زیر کر سکتی ہے..

عابدہ سومرو اسی باضابطہ اور میکانکی حساب کتاب کی ماہر کھلاڑی تھی جس کے نتیجے میں وہ کسی بھی مرد کو نیم دیوانگی کی حدوں تک لے جا سکتی تھی اور اُسے چت کر کے اُس پر سوار ہو سکتی تھی.. وہ ہرگز ایک پر تاثیر اور بندے کو اوندھا کر دینے والی عورت نہ تھی..

چھریرے اور لچکیلے بانس ایسی... ایک سکول گرل ایسے بدن کی.. ایک میٹھی اور بھرائی ہوئی.... بھری ہوئی جنسی آواز کی مالک عورت تھی جو اناڑی نہ تھی.. بساط پر بیٹھتی تھی تو طے کر کے بیٹھتی تھی کہ اتنی چالوں میں بادشاہ کو اوندھا کرنا ہے.. جو چند لمحوں میں اپنی عام سی شکل اور شخصیت کو بھلا دیتی تھی اور مرد اُس کی گہری گیلاہٹ سے بھری آواز کے بھنور میں ڈوبنے لگتا تھا۔

وہ بھی اُنہی دنوں اور وقتوں میں اُبھری جن دنوں غلافی آنکھیں مسلسل آنسو بہاتی تھیں.. وہ اُس کے آنسوؤں کے بیچ میں سے اپنی جگہ بناتی ایسے نمودار ہوئی جیسے وہ اُنہیں پونچھنے کے لئے آئی ہو..

خاور کو بہت دیر کے بعد احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے..

وہ ایک اور ٹیلی فونک کال تھی..

ابھی اُس جہاز نے لینڈ نہیں کیا تھا جس کے اندر غلافی آنکھوں نے اُسے شرمندہ کیا تھا..

ابھی اُس جہاز سے باہر آتے ہوئے اُس نے 'تم ایک شرمناک عورت ہو۔ میں آج کے بعد کبھی بھی تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا' نہیں کہا تھا..

بشیر اپنی نو بیاہتا بیوی کی آگ میں سلگتا بے چین ہوتا اُس کا کھانا لگا کر اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا.. بارہ کہو کے گھر کے اندر.. اپنے ڈرائنگ رُوم کے اکلاپے میں وہ ٹیلی ویژن سکرین کو دیکھے بغیر اُسے دیکھتا جا رہا تھا کہ اُسے بہر حال کچھ دیر تک جاگنا تھا.. اور اُسے یہ بھی آس تھی کہ شاید اُس کی تینوں بیٹیوں میں سے کسی ایک کو اُس کا خیال آ جائے اور وہ اُسے ٹیلیفون کر دے..

فون کی گھنٹی بجی تو وہ بے حد اشتیاق سے اُٹھا.. اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا کہ پُر اشتیاق ہونے کے باوجود اُٹھنے سے اُس میں ایک ٹیس بھی اُٹھتی تھی..

"ہیلو..."

یہ نہ اُس کی بے چین اور ٹیلی فون بل کو کم سے کم رکھنے کی کوشش میں کسی بیٹی کی چیختی ہوئی ہائے ڈیڈ.. ہاؤ آر یُو... آر یُو او کے.. میں ذرا جلدی میں ہوں.. گڈ بائے اور پلیز اپنا خیال رکھیں" آواز تھی اور نہ ہی دوسری جانب غلافی آنکھوں میں سے برستی کوئی سسکی تھی.. خاموشی تھی..

"ہیلو" اُس نے پھر کہا..

"سائیں آپ سو تو نہیں گئے..؟" یہ پہلی چال تھی..

"نہیں.."

"سائیں آپ اگر آرام کر رہے تھے تو ہم معافی کے خواستگار ہیں.. دوبارہ فون کریں گے"

"نہیں.. لیکن آپ کون ہیں؟"

"ہم تو آپ کے مرید ہیں سائیں.." یہ وہی آواز تھی. بیٹھی ہوئی.. جنس کی رطوبت میں گندھی ہوئی.. رچی اور نچڑتی ہوئی "آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا سرکار..."

"جی نہیں... فرمایئے.."

"سائیں اب اتنا فارمل ہو کر ہمارا دل تو نہ دکھایئے... ہم نے کیا فرمانا ہے.. فرمان تو آپ کا چلے گا.. آپ حکم کرنے والے ہیں اور ہم تعمیل کرنے والے..."

"آپ ہیں کون؟"

"ہم سے آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ہم کون ہیں.. ہمیں خبر ہوتی تو آپ کو بتا دیتے.."